بشیر احمد سعدی

سرسیّد احمد خان

نام و نسب

سیّد احمد خان، نام تھا، سیّدنا حسین ابن علی ابن ابی طالب ابن عبد المطلب قرشی الہاشمی کی اولاد سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب چھتیس ۳۶ واسطوں سے حضور محمد رسول اللہ (ابن عبداللہ ابن عبد المطلب قرشی الہاشمی) صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

ولادت

سیّد احمد خاں، اسلامی ہند کے دار الحکومت، دہلی میں پیدا ہوئے۔ سن ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء بمطابق ۱۲۳۲ھ ہے۔ سیّد احمد خان کے باپ دادا، بنی عباس کے زمانے میں عرب سے ایران چلے آئے اور ہرات میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ پھر جس زمانے میں اسلامی ہند پر مغل شہنشاہ، شہاب الدین شاہجہان کی حکومت تھی سیّد احمد خان کے اجداد ہرات سے دہلی آ گئے۔ جہاں ان کا شاہجہان کے زمانے سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک سلاطین مغلیہ کے دربار سے تعلق برابر قائم رہا۔

سیّد احمد خان کے والد، میر محمد متقی ایک آزاد طبع، درویش صفت اور صوفی منش بزرگ تھے حضرت شاہ غلام علی سے انہیں خاص عقیدت و ارادت تھی۔ وہ ان کے مرید تھے۔ اس لئے اپنا بیشتر وقت انہی کی خدمت میں گزارتے تھے۔ مگر تھوڑا سا زمانہ انہوں نے شاہی دربار میں بھی گزارا۔ جہاں شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک وہ اسی منصب پر فائز تھے کہ جس پر اس سے پہلے ان کے والد ماجد فائز رہے۔ میر محمد متقی کو اکبر شاہ ثانی کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے خاص التفات اور اخلاص تھا۔ اس لئے شاہ عالم کے انتقال

کے بعد جب اکبر شاہ ثانی کا زمانہ آیا تو ان کا منصب پہلے سے اور بھی زیادہ ہوگیا۔ اہلِ دربار انہیں بے حد تعظیم و تکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

تیراکی اور تیراندازی میں جو اسلامی ہند خاص کر عہدِ مغلیہ میں شرافت کا جوہر خیال کی جاتی تھی، میر محمد متقی کو کمال حاصل تھا۔ اس فن میں اکثر شرفائے دہلی ان کے شاگرد تھے۔ خود سید احمد خان نے بھی تیراکی اور تیراندازی کا فن اپنے والد ماجد میر محمد متقی ہی سے حاصل کیا تھا۔

سید احمد خان کے نانا، خواجہ فرید الدین احمد خاں بھی اپنے زمانے کے نہایت معزز بزرگ تھے۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے وزیر بنے۔ اس سے پہلے انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ایران اور برما کا سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ عہدِ مغلیہ میں ان کو نواب دبیر الملک کے نام سے یاد کیا جاتا، نواب کے ایک سگے بھائی شاہ فدا حسین بھی تھے جو رسول شاہی فقیروں میں بہت نامی فقیر گزرے ہیں جنہیں پنجاب کا سکھ مہاراجہ رنجیت سنگھ دو سو روپے ماہانہ بطور نذرانہ دہلی بھجوایا کرتا تھا۔ الغرض یہ کہ سید احمد خاں حسب و نسب کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ چونکہ اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کی ولادت کے چھ برس بعد پیدا ہوئے۔ اس لئے ان کی ولادت پر ان کے والدین کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔

تعلیم و تربیت

سید احمد خاں کی تعلیم و تربیت میں زیادہ تر حصہ ان کی والدہ محترمہ کی خاص توجہ اور کوششوں کا ہے۔ کہتے ہیں ماں کی آغوش، تربیت گاہِ اول ہے۔ وہ اگرچہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں صرف قرآن حکیم اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں تاہم دور اندیشی اور دانشمندی میں بہت آگے بڑھی تھیں۔ انہوں نے سید احمد خاں کی تعلیم و تربیت میں جس توجہ اور انہماک سے کام لیا اس سے اس مقولے کو حرف بحرف سچ ثابت کر دکھایا۔

ایک مرتبہ سید احمد خان نے گھر کے ایک پرانے اور بوڑھے نوکر کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ وہ اس وقت تقریباً گیارہ برس کے تھے۔ والدہ کو اس حرکت کا پتہ چلا تو وہ سخت خفا ہوئیں اور ایک نوکرانی کو حکم دیا کہ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے جائے اور سڑک پر لے جا کر تنہا چھوڑ آئے۔ بھلا نوکرانی کی کیا مجال جو حکم کی تعمیل نہ کرتی۔ دوسری نوکرانی کو سید احمد خاں کے حال پر ترس آیا۔ وہ چپکے سے نکلی اور خالہ کے گھر لے

گئی ۔ اگرچہ یہاں پناہ تو مل گئی تاہم بڑی بہن کے غصّے اور جلال سے وہ بھی خوف کھاتی تھیں۔ سید احمد خاں سے بولیں۔ دیکھو آپا تم سے بہت خفا ہیں۔ تمہیں کوٹھے پر ایک کمرے میں چھپائے دیتی ہوں۔ جب تک میں تمہیں وہاں سے نہ بلاؤں وہیں رہنا۔ اگر آپا کو معلوم ہوگیا تو پھر ہم دونوں ہی کی شامت آجائے گی۔ غرض سید احمد خاں اپنی والدہ کے ڈر سے تین دن تک اپنی خالہ کے ہاں چھپ کر بیٹھے رہے۔ آخر کار ان کی خالہ انہیں گھر واپس لے گئیں۔ ان کا قصور معاف کرنے کی سفارش کی۔ ان کی والدہ نے کہا ہاں صرف اس شرط پر معاف کیا جاسکتا ہے کہ وہ نوکر کے پاس جائیں اور معافی مانگیں۔ الغرض سید احمد خان نوکر کے پاس ڈیوڑھی میں گئے۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تب جا کر کہیں سید احمد خاں کی والدہ نے ان کا قصور معاف کیا۔

جس زمانے میں سید احمد خاں کے بڑے بھائی مرض الموت میں مبتلا تھے، ان کی والدہ ان کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ تقریباً ایک مہینے تک یہی کیفیت رہی۔ چونکہ وقت ان کا قریب آچکا تھا۔ اس لئے وہ صحت یاب نہ ہو سکے اور ایک طویل عرصے تک بستر علالت پر رہ کر انتقال کر گئے۔ ہر چند کہ یہ دنیا ایک سرائے فانی ہے جو یہاں آتا ہے وہ ایک دن ضرور چلا جاتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ آنے والا درحقیقت جانے ہی کے لئے آتا ہے۔ مگر اس کا کیا کیجئے کہ دل ہے جانے کا صدمہ ضرور محسوس کرتا ہے اور جیسے خوشی میں ہنسنا فطری بات ہے ایسے ہی غم میں رونا بھی فطری امر ہے۔ سید احمد کے بھائی کے مرنے پر سبھی روئے اور گریہ زاری کی۔ ان کی والدہ بھی ماما کے بارے روئیں اور خوب روئیں کہ وہ ان کے لخت جگر تھے۔

اتنے میں صبح صادق ہوگئی۔ سید احمد کی والدہ نے وضو کیا اور مصلّے پر جا بیٹھیں۔ نماز ادا کی پھر تسبیح پڑھنے لگیں۔ حتیٰ کہ اشراق کا وقت ہوگیا۔ اجالا پھیل گیا اور سورج نکل آیا۔ وہ مصلّے ہی پر بیٹھی رہیں۔ انہی دنوں سید احمد خاں کے گھرانے میں بیٹی کی شادی ہونے والی تھی مگر سید احمد کے بھائی کا عین وقت پر انتقال کر جانا اس میں رکاوٹ بن گیا۔ بیٹی والوں نے سوچا کہ ابھی تو مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا شادی کی تقریب ایسے وقت میں کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ بہتر ہے کہ اسے کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیں۔ اگرچہ شادی کا تمام سامان تیار ہو چکا تھا اور تقریب میں صرف چار دن باقی رہ گئے تھے، ہم سید احمد کے بھائی کے صدمے کے باعث اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھنا ہی صحیح خیال کیا۔

ادھر جب سید احمد خان کی والدہ کو پتہ چلا تو وہ تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور بولیں کہ لو میں تمہارے یہاں شادی میں آئی ہوں۔ مرنے والے کا غم، اس کا ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور اب شادی کو ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا۔ جو کچھ اللہ تعالےٰ کو منظور تھا وہ تو ہو رہا پھر شادی کو ملتوی کرنے سے اب کیا فائدہ۔ جب میں خود تمہارے

گھر چل کر آئی ہوں اور شادی کی تقریب منانے کی اجازت دیتی ہوں تو پھر تم لوگوں کو اب اس میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ جب خود مجھ ہی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر کوئی دوسرا شخص تمہیں کیا کہہ سکتا ہے۔

جب سید احمد خاں کے نانا دبیر الملک نے مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں وزارت سے استعفیٰ دیا تو اسوقت پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جو اس وقت فرمانروا تھا، چاہتا تھا کہ دبیر الملک اس کے پاس چلے آئیں اور اس مقصد کے لئے مہاراجہ نے اپنے ایک قابل اعتماد شخص کے ہاتھ سفر کے خرچ کے لئے معقول رقم انہیں بھجوائی اور دہلی سے لاہور چلے آنے کیلئے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ گھر کے تمام لوگ چاہتے تھے کہ جب مہاراجہ کو ان کے چلے آنے کا اس قدر اشتیاق ہے تو دبیر الملک اس کی دعوت کو ضرور قبول کریں۔ مگر دبیر الملک کی صرف بڑی بیٹی ہی اس گھر میں ایک ایسی خاتون تھیں جو معاملے کے تمام پہلوؤں کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے پدر گرامی قدر کو اس دعوت کے قبول کرنے سے روکا اور کہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے۔ بڑے آرام و آسائش کے ساتھ جب تک آپ سلامت ہیں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس پر یہ کہ آپ کا عالم ضعیفی بھی ہے۔ بھلا اس بڑھاپے میں آپ اپنے آپ کو کہاں کہاں لئے پھریں گے۔ میری مانیں تو آپ یہیں دہلی میں رہیں لاہور نہ جائیں۔ ہمیں یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ کہ آپ رنجیت سنگھ کی عملداری میں چلے جائیں اور ہم انگریز کی عملداری میں رہ جائیں۔ دبیر الملک کے دل پر بیٹی کی باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے شکریے کے ساتھ سفر کا خرچ واپس کر دیا اور لاہور جانے سے معذرت کر دی۔ دبیر الملک کی یہ بیٹی جن کے حسن تدبر سے ان کا خاندان مصائب و آلام کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ وہی خاتون ہیں جو آگے چل کر ملت اسلامیہ کے اس نامور فرد کی والدہ ماجدہ کہلائیں جن کی کوششوں کا زمانہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی تمہید ثابت ہوا۔

حقیقت میں تعلیم نام ہے اخلاقی تربیت اور علمی شعور کا۔ جس طرح کسی بلند و بالا، عالیشان عمارت کے لئے اس کی بنیاد کا مضبوط اور مستحکم ہونا ضروری ہے، اسی طرح کسی شخصیت کی نشوونما اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے آغوش مادر یعنی درس گاہ اوّل کا جو بمنزلہ بنیاد کے ہے، پاک صاف اور منزہ و پاکیزہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ بلاشبہ سید احمد خان کی شخصیت، ان کے کردار اور سیرت کا حقائق کے آئینے میں بغور مطالعہ کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کی والدہ محترمہ کے التفات خصوصی اور تعلیم و تربیت کا فیضان ہے۔

رسمی طور پر سید احمد خاں کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے رواج کے مطابق عربی و فارسی زبان کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ بالخصوص علم ریاضی میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ یوں معلوم

ہوتا تھا جیسے یہ علم انہوں نے اپنے موروثی ترکے میں پایا ہے۔ اس کے علاوہ فن حرب سے جس کا جاننا اس زمانے کے شرفاء کی علامت شمار ہوتا تھا۔ سید احمد خاں خوب واقف تھے تیر اندازی کی انہوں نے خاص طور پر مشق کی تھی۔

سید احمد خاں جب اپنے زمانے کے مروجہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تو ۱۸۲۸ء میں انہوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کی عمر بائیس برس کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی ہند کی حکومت روبہ زوال تھی اور مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ انگلستان کے تاجر جو اسلامی ہند میں تاجروں کا لباس پہن کر داخل ہوئے تھے اب ملکی غداروں کی مدد سے ہندوستان کی حکومت کا تاج پہننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اگرچہ خاندان کے لوگوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ سید احمد خاں ملکی غاصبوں یعنی انگریزوں کی ملازمت اختیار کریں تاہم اسلامی ہند کے سیاسی حالات جس برق رفتاری کے ساتھ روز بروز بدلتے جا رہے تھے۔ ان کے پیش نظر سید احمد خان نے گھر کے افراد کی مخالفت کے باوجود انگریزوں ہی کی ملازمت اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا۔

درحقیقت اسلامی ہندوستان کی حکومت روبہ زوال ہوتے ہوئے جو سیاسی رخ اختیار کرتی جا رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے سید احمد خاں نے اس بات کا صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ آج نہیں تو کل مسلمانوں کے گلے میں انگریزوں کی غلامی کا طوق ضرور پڑ جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام ہو جانے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے غیظ و غضب کے جس طرح سے وہ شکار ہوئے ان سے ماضی کے ان خطرات کی حرف بحرف تصدیق ہو گئی ۔ جو سید احمد کے دل میں بہت پہلے پیدا ہوئے۔

یہ درست ہے کہ سید احمد خاں نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کی اور سرکاری خدمات انجام دینے کے صلے میں سر کا خطاب پایا۔ تاہم اس سے ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ وہ انگریزوں کو پسند کرتے تھے اور پسندیدگی ہی کی بنیاد پر انہوں نے انگریزوں کے اس تعلیمی نظام کو پھیلانے میں بھرپور حصہ لیا جسے لارڈ میکالے نے ۱۸۵۳ء میں رائج کیا اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ رکھا کہ حکومت کی مشینری کو چلانے کے لئے مروجہ نظام تعلیم کے تحت اسکولوں اور کالجوں سے جن کی حیثیت کارخانوں سے زیادہ نہیں۔ مشین کے کل پرزے تیار کئے جائیں۔

ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کے سیاسی نظریات اور مذہبی خیالات سے علمائے اسلام کے ایک طبقے کو شدید اختلاف رہا ہے۔ تاہم اس میں کوئی کلام نہیں کہ سر سید احمد خاں نے اپنے ذہن سے جو کچھ سوچا اور اپنے ہاتھوں سے جو کچھ کیا ان میں ان کی نیت نیک تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ دین الٰہیہ کی خدمت اور ملت اسلامیہ کی حفاظت کا سامان ہو جائے۔ سر سید احمد خاں کی زندگی کے واقعات اور حالات کا مطالعہ

کرتے ہیں تو یہ بات ہم پر بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انگریز کے زمانے میں سرسید کا وجود سرکاری ملازم کی حیثیت سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا فرعون کے گھر میں وہ موسیٰ بن کر پیدا ہوئے اور آگے چل کر اپنی قوم کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا سامان مہیا کر جائیں گے۔

اس بات سے کون واقف نہیں کہ ہندوستان پر مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے اور جب انگلستان سے انگریزوں نے یہاں قدم رکھا۔ ملکی سیاست میں دخیل ہوئے۔ تجارت کرتے کرتے حکومت کے خواب دیکھنے لگے تو انہوں نے ہندوؤں دیگر غیر مسلموں اور غداروں کی مدد سے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے حکومت چھینی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب انگریزوں کو ہندوستان کی حکومت حاصل ہو گئی تو بحیثیت سابقہ حاکم قوم کے مسلمانوں ہی کو انہوں نے اپنا سیاسی حریف سمجھا اور اسی عداوت میں انہوں نے مسلمانوں کو ہر میدان میں گرایا اور ہندوؤں کو آگے بڑھایا۔ ایسے زمانے میں جب مسلمانوں پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، سیاسی اور مذہبی غرض ہر اعتبار سے ان کی پسپائی ہو رہی تھی، اتنی بڑی وسیع و عریض دنیا میں کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا۔ سرسید احمد خاں باوجود سرکاری ملازم ہونے کے اپنی خداداد صلاحیت اور قابلیت سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے لئے ڈھال بن گئے۔

انقلاب زمانہ دیکھئے کہ جو حقیقت میں اسلامی ہند کے خود غدار اور باغی تھے۔ جو تجارت کے لئے آئے تھے مگر غاصبانہ قبضہ کر کے ملک پر اپنا تسلط جما بیٹھے۔ وہ ان مظلوموں اور ملک کے مالکوں کو غدار اور باغی گردانتے تھے جن کی عنایات خسروانہ کی بدولت انہیں اسلامی ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کا موقع ملا تھا، خدا کی شان کہ ان حریت پسندوں کی کوششیں اب غدر کہلائیں جو اپنا حق مانگنے کے لئے غاصبوں سے نبرد آزما ہوئے تھے اور ان میں غالب اکثریت مسلمانوں ہی کی تھی اس لئے نزلہ بر عضو ضعیف کے بمصداق مسلمانوں ہی کو انگریزوں کے قہر و غضب کا سب سے زیادہ شکار ہونا پڑا۔ باوجود اس کے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ آزادی فرو ہو چکا تھا ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو تختہ دار پر لٹکایا جا چکا تھا۔ تاہم انگریزوں کے سینے میں ابھی تک مسلمانوں کے خلاف حسد و بغض اور انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ انگریزوں کے دل مسلمانوں کی طرف سے ابھی تک صاف نہیں ہوئے تھے۔ سرسید احمد خاں سرکاری مصروفیات کے باوصف مسلمانوں کی حمایت اور وکالت کرنے کے لئے قلم معجز رقم کا مؤثر ہتھیار لے کر آگے بڑھے اور سب سے پہلے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر دشمنوں کے اس قلعے کو ڈھایا اور اسکا صفایا کیا جس میں بیٹھ کر وہ مسلمانوں پر مسلسل وار کرتے چلے جا رہے تھے۔

حصولِ حکومت کے بعد جہاں انگریزوں پر مسلمانوں کا خون سوار تھا وہاں عیسائیت کا جنون بھی سوار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جیسے بن پڑے ہندوستان کے تمام لوگوں کو عیسائی بنالیں۔ اس مقصد کے لئے اگر عیسائی مبلغوں اور پادریوں نے دن رات ایک کر دیا تو عیسائی حاکموں نے بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

انگریزوں کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ مذہباً عیسائی ہیں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان چونکہ ابتدا ہی سے جنگیں ہوتی چلی آ رہی ہیں اس لئے ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو فوجی محاذ پر انگریزوں کے ہاتھوں شکست ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مسلمانوں کی مخاصمت انگریزوں سے کم ہو گئی وہ برابر انگریزوں کی بیخ کنی کرنے اور انتقام لینے کی فکر میں ہیں۔ اس خیال نے انگریزوں کو مسلمانوں کا اس قدر دشمن بنا دیا کہ وہ ان کا وجود تو کیا سایہ تک دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں کو ہمیشہ اس بات کی تلاش رہتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی کوئی ایسی غلطی پکڑیں جسے حکومت یا حاکم قوم کے افراد کے خلاف اہانت کا بہانہ بنا کر مسلمانوں پر گرفت کریں اور بغاوت و غداری کے جرم میں ان کی گردنیں مار سکیں۔ لفظ نصاریٰ جسے قرآن حکیم میں عیسائیوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے بطور بہانے کے انگریزوں کے ہاتھ آ گیا اور اس لفظ نے مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو جوش انتقام میں پاگل بنا دیا۔

انگریزوں نے اپنے دل میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ نصاریٰ کا لفظ عیسائیوں کے لئے مسلمانوں میں بالکل اسی طرح کی حقارت سے بولا جاتا جس طرح یہودیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تحقیر کے لئے ناصری کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ناصرہ ایک گاؤں کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اسی نسبت سے انہیں مسیح ناصری کہا جاتا ہے۔

انگریزوں نے اپنے دل میں یہ خیال بھی پکا رکھا تھا کہ نصاریٰ کا لفظ ناصری سے نکلا ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی توہین و اہانت کے لئے ہی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اس باطل خیال کے تحت اکثر علمائے اسلام کو حاکم قوم کی اہانت اور حکومت سے بغاوت کرنے کا مجرم قرار دے کر سخت سے سخت سزائیں دیں اور بعضوں کو پھانسی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ حاکموں کی ہر عیب ان کا ہنر اور ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ، حکومت کا قانون کہلاتا تھا۔ کس کا حوصلہ تھا جو صحیح بات زبان پر لاتا اور انگریزوں کا ہاتھ پکڑ کر کہتا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ عدل و انصاف کے خلاف اور سراسر ظلم و استبداد ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر اور سر پر کفن باندھ کر اس کام سے روکنے کا صرف ایک ہی فرد نے بیڑا اٹھایا اور وہ سرسید احمد خاں ہی تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔

سرسید احمد خان نے لفظ نصاریٰ کی تحقیق پر ایک چھوٹا سا رسالہ تحریر کر کے شائع کیا اور ثابت کیا کہ

نصاریٰ کا لفظ ہرگز ناصرہ کے لفظ سے نہیں بنا اور یہ کہ مسلمانوں میں اس کا استعمال حقارت کے طور پر نہیں بلکہ ایک علامت کے طور پر بولا جاتا ہے۔ سرسید احمد خاں نے وضاحت کی کہ نصاریٰ کا لفظ جو عیسائیوں کے لئے قرآن مجید میں آیا ہے ایک ایسا لفظ ہے جسے خود عیسائیوں نے پیغمبر اسلام کے زمانے میں اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ ہر چند ایک انگریزی اخبار نے سرسید کے اس بیان کی اس بنیاد پر تردید کرنے کی کوشش کی کہ دولت انگلشیہ میں کسی مسلمان کو پھانسی کی سزا محض اس لفظ کے استعمال کرنے کے باعث دی گئی۔ تاہم وہ کامیاب نہیں ہوا کیونکہ خود ایک یورپی افسر نے سرسید کے بیان کی تائید کی کہ ہاں ایک مسلمان کو نصاریٰ کا لفظ استعمال کرنے پر موت کی سزا دی گئی۔ سرسید احمد خاں کی اس تحریر کا اثر یہ ہوا کہ آئندہ کے لئے نصاریٰ کے لفظ پر مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کا دل صاف کرنے کے لئے سرسید احمد خاں نے ایک کام یہ کیا کہ انجیل مقدس کی تفسیر لکھی۔ اوّل اس کے لئے جتنی ضروری کتابیں درکار تھیں وہ سب کی سب حاصل کیں۔ پھر ایک انگریزی جاننے والے شخص کو ملازم رکھا۔ وہ انجیل کا اردو ترجمہ سناتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ایک عربی جاننے والے شخص کو ملازمت دی وہ قرآن و حدیث کی اسناد بہم پہنچاتا۔ اسی طرح ایک یہودی عالم کو نوکر رکھ کر عبرانی زبان سیکھی۔ پھر ایک ملازم ایسا رکھا جو سرسید احمد خاں کے اُردو ترجمے کو انگریزی کے قالب میں سمو سکے۔ غرضیکہ سرسید احمد خاں نے سخت ریاضت اور محنت و مشقت سے کام لے کر انجیل کی تفسیر لکھ کر شائع کی۔

انجیل کی تفسیر لکھنے کا اس کے سوا کچھ مقصد نہ تھا کہ انگریزوں کے دل سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کدورت کو مٹایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ دُنیا میں اگر عیسائیت کا ساتھ کوئی مذہب دے سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو بیگانگی اور وحشت پائی جاتی ہے اسے دُور کیا جا سکے۔

بقول مولانا الطاف حسین کے انگریزوں کے زمانے میں اسلام کو ہندوستان میں تین خطرے درپیش تھے۔ اوّل یہ کہ عیسائیت پھیلانے کے جنون میں حاکم قوم کے افراد کیا عوام کیا خواص اسلام پر طرح طرح کے حملے کر رہے تھے۔ خاص کر مسلمانوں پر ان کا زور سب سے زیادہ تھا۔ ایک طرف اگر مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے تو دوسری طرف وہ لوگ جو حکومت کی مشینری چلا رہے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر صوبہ شمال مغرب نے تو پیغمبر اسلام کے خلاف

لائف آف محمد (LIFE OF MOHEMMED) کے نام سے ایک نہایت دلآزار کتاب لکھ ڈالی اور اس انگریز گورنر کا دریدہ دہن جس قدر گستاخیاں ذات رسالتمآبؐ کے باب میں کر سکتا تھا، اس نے گستاخیاں کیں۔ اس کتاب کو دیکھتے ہوئے عیسائیوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ولیم میور نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لئے قسم نہیں لگا رکھا۔ اب ہندوستان میں اسلام کوئی دن کا مہمان ہے۔

اس کتاب کی اشاعت سے یوں تو سبھی اہل اسلام کے دل مجروح تھے مگر اس وقت جو بے چینی اور جوش و خروش سر سید احمد خاں کے دل میں پیدا ہوا، اس کا حال عجیب تھا۔ ہر چند سر سید احمد خاں کے ان دوستوں نے جو لفٹیننٹ گورنر ولیم میور کے ماتحت تھے۔ انہیں اس کتاب کا جواب لکھنے سے روکا اور ڈرایا مگر سر سید احمد خاں نے کسی بات کی پروا نہ کی۔

سر سید احمد خاں نے جب دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ دار و گیر میں اسلامی کتب خانے بھی سب کے سب تباہ و برباد ہو گئے اور وہ تمام ضروری کتابیں جن سے دریدہ دہن گورنر کی کتاب کا جواب لکھنے میں مدد مل سکتی ہے ناپید ہیں۔ تو انہی کتابوں کی تلاش میں لندن کا سفر بھی اختیار کرنا پڑا۔ لندن پہنچ کر انہوں نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ مصر، فرانس اور جرمنی سے عربی کتابیں منگوائیں۔ انگریزی اور لاطینی زبان کی پرانی کتابیں لندن کے بازار سے نہایت گراں قیمت پر خریدیں اور شب و روز کی محنت شاقہ سے بارہ مقالے تحریر کئے۔ ان تمام اعتراضات کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر دریدہ دہن انگریز گورنر نے کئے تھے، مسکت دلائل کے ساتھ جوابات دیئے۔

سر سید علیہ الرحمہ نے مذکورہ مقالات اردو میں لکھے تھے۔ ان کا انگریزی میں ترجمہ ایک لائق فائق انگریز نے کیا تھا۔ اور خطبات احمدیہ کے نام سے پہلی مرتبہ لندن ہی سے شائع کیا تھا۔ وہ لندن جو اس وقت انگریزوں کا مرکز اور ان کی ایسی حکومت کا گھر تھا جس کا سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ ایک محکوم نے خود حاکموں ہی کے گھر میں نہایت بے باکی سے ان کے دعاوی کا ابطال کیا یہ اقدام یقیناً مجاہدانہ تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ کی ذات والاصفات پر جو بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے اور جو بے سروپا اعتراضات کئے تھے وہ درحقیقت صلیبی جنگوں اور اسلام سے عیسائیوں کی دیرینہ عداوت اور مخاصمت کا نتیجہ تھے۔ خطبات احمدیہ میں ان سب کا جواب لکھنے اور اسے شائع کرنے کا جس قدر جوش اور انہماک سر سید احمد خاں کو تھا اور اس سلسلے میں جو مالی مشکلات انہیں پیش آئیں۔ اس کا اندازہ ان خطوط سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

جوانہوں نے لندن سے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں کے نام لکھے۔

مولوی سید مہدی علی خاں المعروف نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں سرسید احمد خاں یوں رقمطراز ہیں۔

"ولیم میور صاحب (انگریز گورنر) کی کتاب (لائف آف محمد) دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا ہے اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے..... لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا، آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ کسی مہاجن سے میرے لئے چار ہزار روپے قرض لیجئے۔ روپیہ اور سود، میں ادا کروں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپے بھیج دو۔ کیا کہیئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ اگر میری یہ کتاب (خطبات احمدیہ) تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا۔

پھر جب خطبات احمدیہ کی اشاعت ہوئی اور ایک ولیم میور کیا جس جس نے بھی پیغمبر اسلام پر اعتراضات کئے تھے ان سب کو جوابات دے دیئے تو اس کی انہیں جو دلی مسرت اور خوشی حاصل ہوئی اس کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ایک خط میں سرسید احمد خاں خود لکھتے ہیں۔ سر ولیم میور صاحب اور، اور مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو، وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو۔ اگر وہ کہے کہ ہاں! سچ ہے اور انصاف کا جواب ہے تو، تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں"۔ میری کتاب خطباتِ احمدیہ ایک مسلمان، عالم متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں"۔

بلاشبہ انگریزوں نے جو مذہباً عیسائی تھے مسلمانوں سے زمام حکومت چھینی تھی اور اس اعتبار سے کہ مسلمانوں کا وجود ان کے نزدیک سیاسی حریف کے طور پر قائم تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے اور ان کے دشمن ہندوؤں اور سکھوں کو آگے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اس لحاظ سے علمائے کرام کا ایک گروہ غیرت قومی و حمیت دینی کی بنیاد پر انگریزوں سے یہاں تک نفرت کرتا تھا کہ اس کے نزدیک انگریزی پڑھنا اور انگریزوں کی نوکری کرنا حرام سمجھا گیا۔ تاہم برطانوی ہندوستان کے مسلمانو

پڑی تھی اس سے نجات پانے کا یہ راستہ نہ تھا۔ بلکہ سیدھی راہ وہی تھی جسے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے سر سید احمد خاں نے تجویز کیا تھا۔ مگر افسوس ہمارے اکثر علمائے کرام نے سر سید احمد خاں کے خیالات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے انہیں اپنی دانست میں کافر و ملحد قرار دے دیا۔ مگر کیا سید احمد خاں واقعی ایسے ہی تھے۔ اس کی تردید مسلمانوں نے تو کیا خود کافروں اور ملحدوں ہی نے کر ڈالی۔ خطبات احمدیہ جب لندن سے شائع ہوئی تو سب سے پہلے لندن ہی کے ایک اخبار نے اس پر اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا۔

"عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انہی کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے۔ جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔"

ریورنڈ پیور ایک انگریز پرنسپل ڈوفٹی کالج لاہور نے کہا مسلمانوں پر نہایت تعجب ہے کہ وہ سر سید احمد خاں کو کافر، ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے نہیں بن آیا۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔

مشہور مستشرق، پروفیسر آرنلڈ (حضرت علامہ اقبال کے استاد) نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں یوں لکھا ہے۔ "ایسی مثالیں تو ضرور مل جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے عیسائیوں کے مقابلے میں اپنی زبان میں اور اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت کے لئے کوئی کتاب لکھی اور اس کا ترجمہ یورپ کی کسی زبان میں شائع ہو گیا لیکن میرے دیکھنے میں آج تک کوئی مثال ایسی نہیں آئی کہ یورپ ہی میں بیٹھ کر کسی مسلمان نے یورپ ہی کی زبان میں اسلام کی حمایت میں کوئی کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔"

القصہ مختصر یہ کہ خطبات احمدیہ ایک ایسی قابلِ قدر خدمت ہے جسکے بارے میں اپنے اور بیگانے سبھی معترف ہیں کہ وہ سر سید احمد خاں کی غیرت قومی اور حمیت دینی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ وہ یقیناً مرد مجاہد تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حفاظت کے لئے تاحیات یعنی اپنی وفات (۱۸۹۸ء) تک برابر سرگرم عمل رہے اور بلاشبہ ان کی تمام تحریکات کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تمہید کا درجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

سر سید احمد خاں جب لندن سے واپس آئے تو انہوں نے خطبات احمدیہ کو دوبارہ بڑی تفصیل کیساتھ مرتب کیا اور اسے اردو زبان میں شائع کر کے اردو زبان کی ترویج اور اسکی ترقی کیلئے بھی خوب کوشش فرمائی۔

٭ ٭ ٭